اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عالم

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی

ریاست (state) ایک مخصوص قسم کی ہیئت اجتماعیہ کا نام ہے۔ ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنیکی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی صورت حیوانیت کے طبعی ارتقاء کی ایک منزل ہے۔ جس طرح متعفن اشیاء میں کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں، جس طرح آب و گل اور تخم کے اجتماع سے خودرو پودے پیدا ہوجاتے ہیں اور جس طرح تیز و تند ہواؤں کے عمل سے ریگستانوں میں ریگ کے ٹیلے بنجاتے ہیں، اسی طرح زمانہ کے آغوش میں محض جذبات حیوانی اور ماحول کے مقتضاء سے مختلف اور متفرق افراد انسانی میں ایک ہیئۃ اجتماعیہ پیدا ہوجاتی ہے جسکو وہ اپنی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی ہیئت اجتماعیہ میں بعض خصوصیات کا اضافہ کرکے اسکو ریاست کا نام دیدیا جاتا ہے۔ لیکن پیدا ہوتی ہے یہ اسی حیوانیت سے جس سے ایسی قوموں کے کل حرکات و سکنات ناشی ہوتے ہیں۔ ایسی قومیں اگر بھیڑوں سے جمہوریت کی تعلیم حاصل کرتی ہیں تو بھیڑیوں سے آمریت کا سبق سیکھتی ہیں۔ انکے علم و عمل دونوں کا ذریعہ ماحول، زمانہ، جذبات اور خواہشوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

راحت و فلاح، قیام و بقاء ایسی جماعتوں اور قوموں کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتی۔ انکی زندگی انکے لیے موت سے تلخ تر ہوتی ہے اور انکی موت پر نہ آسمان روتا ہے نہ زمین کے آنسو نکلتے ہیں۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں وہ اپنے ہی اعمال کے ثمرہ کے طور پر موت و فنا کے قعرِ عمیق میں دھکیل دی جاتی ہیں۔ وہ زمانہ کے بحرِ زخار میں بلبلوں کی طرح پیدا ہوتی ہیں اور اپنی مختصر عمر

پریشانی ، حیرانی اور مصائب میں گذار کر ساحل سے سر ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہیں ۔ نہ اُن کا کوئی مقصدِ حیات ہوتا ہے نہ مرام زندگی ۔ نہ انکو اپنے نقطۂ آغاز کا علم ہوتا ہے نہ نقطۂ انجام کا ۔ نہ وہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں ۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ	اُنکے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں ہیں
بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ	اُنکے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں ہیں
بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ	اُنکے پاس کان ہیں مگر وہ اُن سے سُنتے نہیں ہیں
بِهَا اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ	وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ
اَضَلُّ ۚ	گمراہ ہیں ۔

یورپ کے "ترقی یافتہ حیوانات[1]" ، اُنکے سیاسی و اجتماعی تصورات اور اُنکے نتائج مثال کے لیے بہت کافی ہیں ۔ ورنہ دراصل تو امت مسلمہ کے سوا ہر قوم ، اور ریاست کے اسلامی تصور کے سوا ہر تصور اسی حیوانیت کی پیداوار ہوتا ہے ۔ حال اور ماضی دونوں میں یہ چیز صاف صاف نظر آتی ہے اور عقل و تجربہ دونوں اس کی کھلی ہوئی شہادت دیتے ہیں کہ اجتماع و سیاست کے متعلق جتنے نظریات آج تک دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں اور جن پر دنیا نے عمل کیا ہے ان میں سے ایک بھی بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور راحت و طمانیت کا سبب نہیں بن سکا اور نہ بن سکتا ہے ۔ جمہوریت ہو یا آمریت ، سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت ، سب اسی حیوانیت اور بہیمیت کے مظاہر ہیں انکی شکلیں مختلف ہیں مگر حقیقت سب کی ایک ہے یعنی خدائے بے نیاز سے بے نیازی و بغاوت اختیار کر کے اُس انسان کی حکومت قائم کرنا جسکی حقیقت ان ارباب تحقیق کے نزدیک یہ ہے کہ وہ بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے ۔

[1] یہ لقب خود اہل یورپ کا محبوب و پسندیدہ ہے ، اسلیے کہ انکے نزدیک انسان کی حقیقت ہی یہ ہو کہ وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے ۔

انسان کی فرمانروائی (Sovereignty) بنیاد ہے کل غیر اسلامی سیاسی تصورات و نظریات کی - یہ بنیاد اس قدر کمزور، مہمل، خلافِ عقل اور احمقانہ ہے کہ اسکے اوپر جو عمارت بھی تعمیر کی جائیگی وہ نہ صرف خود بہت جلد منہدم ہو جائیگی بلکہ تعمیر کرنے والوں کو بھی اپنے ملبہ میں ابدالآباد کے لیے دفن کر دیگی - چنانچہ آج یورپ کے ترقی یافتہ حیوانات میں حیوانیت و بہیمیت کا جو مقابلہ ہو رہا ہے اور جس طرح بنی آدم کے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے وہ طبعی نتیجہ ہے اسی انسانی حکومت جیوانی نظریہ جات، اور غیر اسلامی طرزِ تمدن کا -

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

خشکی اور تری میں فساد پھوٹ پڑا ہے لوگوں کے اپنے کرتوتوں سے -

تہذیب مغرب کے شجرِ خبیثہ میں پھل آنے شروع ہو گئے ہیں - ان مہذب حیوانات کو یہ کڑوے پھل کھانے پڑینگے اور پیٹ بھر کر کھانے پڑینگے -

ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ لَآكِلُونَ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زَقُّومٍ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ

پھر اے تکذیب کرنے والے گمراہ لوگو! تم کو زقوم کھانا پڑے گا اور پیٹ بھر کر کھانا ہوگا -

اس زقوم تلخ کا بیج تو تم نے ہی بویا تھا، اب اس کے پھل کھانے سے کیوں گھبراتے ہو؟ یہ سب اسی تہذیب کا نتیجہ ہے جسکو پھیلانے کے لیے تم نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کر دیا تھا۔ یہ سب اسی انسانی فرمانروائی ہی کا تو اثر ہے جس کا قائم کرنا تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے - پھر اسکی تعمیر ہی اسکی تخریب کی ضامن ہے اور تم کو بھی آج تباہی میں اس کا ساتھ دینا چاہیے جس طرح زندگی میں اس کا ساتھ دیتے رہے ہو - فکیف آسیٰ علیٰ قوم کافرین -

خدا جانے یہ کہاں کا انصاف اور کس عقل کا اقتضا ہے کہ انسانوں کے ایک بہت بڑے

گروہ کو انہی کے مثل ایک انسان یا ایک چھوٹی سی انسانی جماعت کا محکوم بنا دیا جائے اور انسان کو انسان کا فرمانروا قرار دیدیا جائے؟ پھر عقل تو یہ بتاتی ہے کہ انسانی فہم قوانین کو سمجھ تو سکتی ہے، مگر انکو بنا نہیں سکتی۔ فہم قانون اور شے ہے اور وضع قانون بالکل ایک دوسری شے۔ خلاقِ عقول نے انسانی عقل کو یہ طاقت ہی نہیں عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے لیے یا دوسروں کے لیے قوانین وضع کر سکے۔ ہم نے تکرارِ مشاہدہ سے معلوم کیا کہ پانی گیہوں کے لیے مفید ہے۔ اس لیے ہم نے یہ قانون بنا لیا کہ گیہوں میں پانی دینا چاہیے۔ لیکن درحقیقت ہم نے کوئی قانون وضع نہیں کیا ہے بلکہ جو قانون قدرت تھا اُسے صرف دریافت کیا ہے۔ ان قوانین کی وضع پر انسان کا قادر نہ ہو بالکل بدیہی چیز اور مسلّمہ مسئلہ ہے۔

قانون کی دوسری قسم وہ ضوابط ہیں جو کسی فرد یا جماعت کے حق کو وجود میں لاتے ہیں یا اسکی حفاظت کرتے ہیں یا اسکو سلب کرتے ہیں۔ سیاسی مباحث میں لفظ قانون زیادہ تر اسی مفہوم میں مستعمل ہے۔ اس قسم کے قوانین کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کا وضع کرنا انسانی عقل کی قدرت سے باہر ہے۔ اس عدم قدرت سے ہماری یہ مراد ہے کہ چونکہ انسانی عقل کی طاقت انکو صحیح وضع کرنے سے قاصر ہے اسلیے اس قسم کے قوانین اگر بنائے جائینگے تو وہ یقیناً غلط ہونگے۔ یعنی انکی وضع کی حقیقی غرض و غایت ان سے ہرگز نہ پوری ہو سکے گی بلکہ وہ انسانوں کے لیے بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہونگے۔ اس مقصد کے اثبات کے لیے مندرجہ ذیل دلائل کافی ہیں:

(۱) سطور بالا میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قانون اُس ضابطہ کا نام ہے جو کسی فرد یا جماعت کے حق کو وجود میں لائے یا اسکی حفاظت کرے یا اسکو سلب کرے۔ قانون کی یہ تعریف بہت جامع و مانع ہے۔ اس تعریف پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع قانون کے لیے واضع کو

مندرجہ ذیل امور کا علم ضروری و لابدی ہے:

(۱) حق کا مفہوم (۲) مختلف اشخاص کی صحیح فطرت اور قوت تاثر کا علم تاکہ قانون کی تاثیرات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے (۳) ان سب جزئیات کا علم جو قانون کے دائرۂ عمل میں آنے والے ہیں تاکہ انکے قدر مشترک کو صحیح طور پر قانون میں داخل کیا جا سکے۔

حق کا مفہوم کیا ہے؟ اسکی صحیح تعیین سے انسانی عقل اپنے عجز کا ثبوت دے چکی ہے ازمنۂ قدیمہ میں طاقت اور حق مترادف سمجھے جاتے تھے۔ جسکی لاٹھی اسکی بھینس پرانی مثل ہے اور آج بھی اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب اسکی تعبیر کے لیے مہذب اور شستہ الفاظ اختیار کر لیے گئے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرنیکے لیے صرف دو ہی راستے ملتے ہیں۔ ایک طبعی طریقہ دوسرا رسمی طریقہ۔ اگر ہم طبعی قوانین کو پیش نظر رکھ کر خالص سائنٹفک نقطۂ نظر سے حق کے مفہوم کو تلاش کرتے ہیں تو بقاء اصلح Survival of the fittest کا اصول ہماری رہنمائی کرتا ہے اور حق اور طاقت دونوں مترادف ٹھیرتے ہیں اور اگر رسم و رواج یا بقول آسٹن جماعت کے اخلاقی تصور کی روشنی میں اسکا چہرہ دیکھیں تو بھی جسکی لاٹھی اسکی بھینس ہی کی مثل حق کا عنوان نظر آتی ہے۔ (دیکھو جان آسٹن کی کتاب Jurisprudence)۔ بلکہ اس صورت میں چونکہ جماعت کا اخلاقی تصور ایک تغیر پذیر شے ہے اس لیے حق کا مفہوم اور بھی زیادہ غیر متعین ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ سوال کہ وہ کونسی شے ہے جسکی بناء پر کسی انسان کے دوسرے انسان کے افعال پر اثر انداز ہونے کو عقلاً جائز کہا جا سکتا ہے، اب تک ناقابل حل ہے اس لیے کہ اس کا صرف ایک جواب پیش کیا گیا ہے اور مادی طرز استنتاج سے صرف وہی جواب ہو سکتا ہے یعنی "طاقت و قدرت"، مگر انسان کی عقل اور فطرت دونوں اس جواب کو صحیح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور دونوں اسکو غلط و گمراہ کن قرار دیتی ہیں۔ لہذا بالآخر یہ ماننا پڑیگا کہ یہ سوال ابھی تک

لاینحل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ڈاکوؤں کا گروہ جو سلب و نہب کی طاقت رکھتا ہے، محض طاقت کی بنا پر اسکے ان افعال کو کوئی عاقل جائز نہیں قرار دے سکتا۔

رہا ان سب اشخاص کی صحیح فطرت اور جہت تاثر کا علم اور ان کل جزئیات کا علم جو قانون کے تحت میں داخل ہونے والی ہیں تو یہ اور بھی ناممکن ہے۔ اولاً اس لیے کہ اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے، لے دے کے اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ استقرا ہے جو علم و یقین نہیں پیدا کر سکتا۔ ثانیاً اس لیے کہ انسان احوال کا غلام ہوتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی فطرت کو اپنی ہی فطرت پر قیاس کر لیتا ہے اور علیٰ ہذا اسکے سامنے جو افراد و جزئیات موجود ہوتے ہیں انہیں پر آئندہ جزئیات کو قیاس کر لیتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ساخت کے تمام قوانین اسی قسم کی کمزوریوں سے لبریز ہیں۔ اور نہ صرف انکی جامعیت معرض زوال میں ہے بلکہ انکی افادیت بھی غیر متیقن ہے۔

الغرض وضع قانون کے لیے جن چیزوں کا علم ضروری و لابدی ہے ان میں سے ایک کا علم بھی انسان نہیں حاصل کر سکتا جسکا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ وہ قانون وضع کرنے سے قاصر ہے۔

(۲) قانون کی جو تعریف بھی کیجیے ہر صورت میں یہ ماننا پڑیگا کہ قانون ایک ایسے اصول کا نام ہے جو انسان کے خیالات، اخلاق یا اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے صرف یہی تین اجزا ہیں، اس لیے جو قانون بھی وضع کیا جائیگا اسکا تعلق یا تو انسانی خیالات سے ہوگا یا اسکے اخلاق سے یا اسکے اعمال و افعال سے۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان خود متاثر ہوتا ہے اور اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ بالکل انہی کے تابع رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ان اجزا زندگی کے لیے وہ خود کوئی قانون کس طرح وضع کر سکتا ہے؟ قانون وضع کرنے کے معنی تو یہی ہونگے کہ زندگی کے یہ اجزا ثلثہ واضع قانون کے تابع ہوں، مگر جبکہ واضع قانون خود ان کا تابع ہے تو یہ اس کے تابع

کیسے ہو سکتے ہیں؟ بنا بریں یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنے خیالات، اعمال، یا اخلاق، کے لیے کوئی قانون وضع کر سکے۔ دراصل جو چیز قانون کی شکل میں اسکے ذہن میں آتی ہے وہ ایک فطری اثر اور نتیجہ ہوتا ہے انہیں اجزا ثلثہ میں سے کسی گزشتہ یا موجودہ جزو کا یا کل اجزا کا۔

(۳) ایک انسان کو بدو طفولیت سے کسی ایسے مقام پر قید کر دیا جائے جہاں کسی دوسرے انسان کی صحبت اس کو میسر نہ ہو سکے اور تعلیم و تعلم کے کل ذرائع اس کے لیے مسدود کر دیئے جائیں۔ ایسا آدمی جوان بلکہ بوڑھا ہو کر بھی قطعاً لا یعقل اور جاہل محض رہیگا اور دوسروں کے لیے تو بڑی بات ہے اپنی انفرادی زندگی کے لیے بھی کوئی قانون وضع نہیں کر سکیگا۔ البتہ چند قوانین پر عمل پیرا ضرور ہوگا۔ ان قوانین میں سے بعض تو وہ ہونگے جن پر وہ جبلّی طور پر محض مجبورانہ عامل ہوگا مثلاً اشتہا کے وقت غذا کھانا، پیاس کے وقت پانی پی لینا، سردی و گرمی سے بچنے کا انتظام کرنا۔ اور بعض قوانین وہ ہونگے جو طبعی قوانین سے اس نے مستنبط کیے ہونگے۔ بہر حال وہ کوئی قانون وضع نہیں کر سکتا صرف استنباط کر سکتا ہے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی عقل کو فطرتاً یہ قوت نہیں دی گئی ہے کہ وہ کوئی قانون وضع کر سکے۔ البتہ استنباط قوانین کی قدرت اسکو عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کی تعلیم و تربیت جب کی جاتی ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ جب اسکو معلوم شدہ قوانین بتائے جاتے ہیں اور طبعی قوانین کی جانب اسکی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے تو وہ ان قوانین کو سیکھتا ہے اور اسکے ساتھ ہی ساتھ ان قوانین سے دوسرے قوانین مستنبط بھی کر لیتا ہے۔ اسی استنباط کو مدعیان عقل و دانش اپنی خوش فہمی سے وضع قانون سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسکی حقیقت محض استنباط ہے۔

واضح رہے کہ تعلیم و تربیت انسان کی فطری قوتوں کو نشو و نما تو دے سکتی ہے لیکن اس میں کوئی جدید قوت پیدا نہیں کر سکتی۔ اسلیے جب وضع قانون کی قوت انسان میں فطری طور پر

موجود ہی نہیں ہے تو تعلیم و تربیت کی بہتر سے بہتر صورت بھی اس میں اس قدرت کی تخلیق نہیں کر سکتی۔ اب یہ امر بالکل صاف ہو گیا کہ وضع قانون کا حق مخصوص ہے اس خلاق عظیم کے ساتھ جس نے انسان، اسکی فطرت، اسکے اعمال اور افعال سب کو پیدا کیا ہے۔ وہی ان سب چیزوں کا کما حقہٗ علم رکھ سکتا ہے اور وہی ان کے لیے قانون وضع کر سکتا ہے۔

پھر جب انسان میں وضع قانون کی قوت ہی نہیں ہے تو وہ اگر اسکی کوشش کریگا تو یقیناً غلطی کریگا اور یقیناً اسکی عقل اس غیر معمولی اور اپنی قوتِ برداشت سے زائد بوجھ کو اٹھانے کی وجہ سے ضعیف ہو کر سخافت و سفاہت کے درجہ تک گر جائیگی۔ اس کا واضح مشاہدہ ہم یورپ کے ترقی یافتہ حیوانات کی حکمت آرائیوں میں کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی استعداد سے بڑھ کر کام کرنے کا نتیجہ پریشانی تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد کہ انسان کو وضع قانون کی قوت حاصل نہیں ہے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ انسان فرمانروا بھی نہیں بن سکتا۔ یہی وہ خط فاصل ہے جو ابتداء اور بنیاد ہی سے اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست میں فرق و امتیاز پیدا کر دیتا ہے اور اتنا فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ان دونوں میں کسی مقام پر بھی اتصال و اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اسلامی ریاست کا بنیادی اصول غیر اللہ کی فرمانروائی کی نفی کامل اور محض اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی کا کامل اثبات ہے۔ اور غیر اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد انسانی فرمانروائی ہے۔ اسلام لا الٰہ کی تعلیم دے کر ہر غیر اللہ کی فرمانروائی کی نفی کر دیتا ہے اور الا اللہ کی تعلیم دے کر فرمانروائی کو ذات حق سبحانہٗ کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے ان الحکم الا للہ حکومت و فرمانروائی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو پہنچتا ہے۔

(۱) ذالکم اللہ ربکم لہ الملک — وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے بادشاہی صرف اسی کی ہے۔

(۲) لم یکن لہ شریک فی الملک — اسکی بادشاہی میں کوئی اسکا شریک نہیں ہے۔

(۳) الا لہ الخلق والامر — خبردار ہو جاؤ اسی کیلیے خلق اور امر دونوں مخصوص ہیں۔

(۴) ولا یشرک فی حکمہ احداً — وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

مندرجہ بالا آیات اور انکے علاوہ اور متعدد کثیر آیات اس چیز کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام غیر اللہ کی حکمرانی قطعاً ناجائز قرار دیتا ہے اور اسکو کسی حالت میں بھی روا نہیں رکھتا۔ صرف اسلامی ریاست ہی کا نہیں خود اسلام کا سنگ بنیاد بھی یہی اصول ہے۔ اسلام نام ہی ہے حکومت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی میں داخل ہو جانیکا۔ اس لیے اس اصول کو چھوڑ کر اور غیر اللہ کی فرمانروائی کو جائز قرار دینے کے بعد سرے سے اسلام کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ افسوس اور حیرت ہے ان زعماء ملت پر جو چیخ چیخ کر مسلمانوں کو جمہوریت اور مشترک وطنی حکومت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اسلام کا رشتہ انسانی فرمانروائی سے جوڑتے ہیں۔

اسلامی نظام حکومت کے برعکس سیاست و ریاست کے متعلق جسقدر غیر اسلامی نظریات اب تک پیش کیے گئے ہیں اور جسقدر قیامت تک پیش کیے جائینگے ان سب میں انسانی فرمانروائی کا نظریہ مشترک اور اہم ترین جزو ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے اصولی حیثیت سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ چیز سرے سے غلط ہے اور یہ کہ فرمانروائی کا حق مخصوص بذات حق سبحانہ ہے۔ انسانی فرمانروائی کے ابطال کے بعد ہر غیر اسلامی سیاسی نظریہ کا باطل ہونا قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے خواہ وہ جمہوریت ہو یا سلطانیت یا دنیا کا اور کوئی سیاسی نظریہ۔ اس لیے اب اسکی حاجت نہیں ہے کہ ہر ایک غیر اسلامی سیاسی نظریہ کو علیحدہ علیحدہ باطل کیا جائے۔ تاہم مزید توضیح اور اتمام حجت کے لیے ہم ان سب پر علیحدہ علیحدہ بھی تنقید کر کے انکی غلطی قطعی طور پر واضح کیے دیتے ہیں تاکہ اس دور کشمکش میں جبکہ نظریات کا تصادم نہایت شدت کے ساتھ صرف ذہنوں، زبانوں اور کاغذوں ہی پر نہیں بلکہ جنگ کے میدانوں میں بھی ہو رہا ہے لوگ صحیح مقصد کا تعین کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ

خدا سے بے نیاز ہو کر جو نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے ایک لعنت ہے جس سے جس قدر جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اسی قدر بہتر ہے اور عالم کی صلاح و فلاح کا ایک اور صرف ایک ذریعہ یہی ہے کہ وہ اسلام کے سیاسی نظریے کو قبول کرے یعنی غیر اللہ کی فرمانروائی کو مٹا کر محض اللہ تعالیٰ کی حکومت و فرمانروائی قبول کرے۔

تاریخی پہلو

ریاست جو سب سے اہم اجتماعی ادارہ ہے اسکی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں اور یورپ کے فلاسفہ کے اس مسئلہ پر مختلف اقوال و خیالات ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خاندان اولین معاشرہ ہے جو دنیا میں پیدا ہوا اور اس قسم کے مختلف معاشروں کے باہمی اجتماع سے طبعی طور پر ریاست وجود میں آگئی۔ کوئی کہتا ہے کہ خوف و دہشت کے جذبہ سے متاثر ہو کر مختلف اور متفرق انسانی افراد ریاست کو وجود میں لانے پر مجبور ہو گئے کسی کا قول ہے کہ ریاست افراد انسانی میں ایک اجتماعی معاہدہ (Social contract) کا نتیجہ ہے۔ غرض اس سلسلہ میں بکثرت اور مختلف باتیں کہی جاتی ہیں اور ان سب کا محور ایک خیال ہے یعنی حقیقت انسانی کے متعلق یہ مفروضہ کہ وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جس طرح بھیڑ بکری اگائے، بھینس وغیرہ کے افعال و حرکات انکے ضروریات و ماحول کے لحاظ سے ہوتے ہیں اسی طرح انسانی افعال بھی انہی چیزوں کے تابع ہوتے ہیں۔ مقصد سب کا یہی ہے محض بیانات کا فرق ہے۔ اور یہ فرق بھی اس لیے ہے کہ کسی نے انسان کی بالکل ابتدائی (مفروضہ) حالت سے ریاست کی تاریخ کی ابتدا کی ہے اور کسی نے بعض درمیانی مدارج سے اسکو شروع کیا ہے۔

قرآن مجید اگرچہ فن تاریخ کی کتاب نہیں ہے اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کوئی مورخ تھے، لیکن چونکہ شرف و فلاح انسانی سے اس مسئلہ کا تعلق ہے اسلیے اسلام نے اس

مسئلہ کے تاریخی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ انسان دنیا میں خلافتِ الٰہی کی نعمت اپنے ساتھ لے کر آیا تھا بلکہ تخلیق آدم علیہ السلام کا مقصد ہی خلافت الٰہیہ کا قیام تھا۔ اس مرتبۂ علمی کے ساتھ انسان کو اس کی ابتدا، آفرینش ہی میں نوازا گیا اور سب سے پہلے خلیفۃ اللہ فی الارض حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو دنیا کے سب سے پہلے انسان بھی تھے۔ یہ ہے ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنے کی دوسری صورت جو اول الذکر صورت سے بالکل متضاد ہے اور جس کی بنیاد عقلی و فطری اصول اور تشریعی و الٰہی احکام و علوم پر قائم ہے۔

لیکن اسلام اس کا منکر نہیں ہے کہ ریاست نے اپنے ارتقائی مدارج طبعی و حیوانی منہاج پر طے کیے ہیں۔ بلاشبہ ایسا ہوا ہے۔ مگر ریاست کی حقیقی ابتدا اس صورت سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اولاد آدم علیہ السلام کے پھیلنے کے بعد جذبات اور ماحول، نفس اور شیطان کے وساوس کا شکار ہو کر ایک کثیر انسانی جماعت نے ریاست کے اسلامی تصور کو بھلا دیا اور غیر اسلامی یعنی غیر انسانی طریق پر ریاست و حکومت کی بنیادیں قائم کرنا شروع کیں۔ اس قسم کی حیوانی ریاستوں کی تاریخ اور انکے وجود میں آنے کے اسباب بلاشبہ وہی ہیں جو یورپ کے فلاسفہ ذکر کرتے ہیں۔

خیر و شر اس عالم میں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اسیلے ریاست کے تصور کے دو سلسلے ابتدائے آفرینشِ انسان سے لے کر آج تک جاری رہے ہیں۔ ایک تو ریاست کا اسلامی تصور اور دوسرا غیر اسلامی تصور۔ ایک خدائی حکومت کا تصور دوسرا حیوانی حکومت کا تصور۔ ایک خالص اصولی ریاست کا تخیل دوسرا جذبات، اور ہوا و ہوس کی ریاست کا تخیل۔ کل انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اسی حکومت الٰہی کی تعلیم و تبلیغ کے لیے تشریف لائے۔ لیکن اس کا واضح تفصیلی اور مکمل ترین خاکہ محض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے سامنے علمی و عملی صورت میں پیش کیا گیا اور کسی نبی نے اسکی اتنی واضح اور مکمل شکل کبھی نہیں پیش کی تھی۔

الحاصل اسلامی اور غیر اسلامی ریاستوں کا اختلاف محض اصول اور خاکہ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ انکی روحیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متبائن ہیں۔ اسلامی ریاست کی روح عبدیت اور اتباع امر الٰہی ہے اور غیر اسلامی ریاست کی روح طغیان اور اتباع ہوا۔ پھر ظاہر ہے کہ جس ریاست کی بنیاد کسی عقلی اصول اور اخلاقی ضابطہ پر قائم ہو بلکہ محض خواہشاتِ نفس پر، خواہ ان خواہشات کا محرک جذبۂ حُبِ جاہ و اقتدار ہو یا خوف و ہراس، بہر حال اس میں شرکت کرنے والوں کو کبھی راحت و فلاح میسر نہیں ہو سکتی اور نہ وہ کبھی مطمئن رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اور موجودہ دور کے واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر سیاسی نظریے آجتک دنیا کے سامنے آئے وہ سب تجربے سے غلط اور نقصان رساں ہی ثابت ہوئے اور ان نظریوں کو قبول کرنے والے بہت جلد خود ان سے متنفر ہو گئے حتی کہ جس طرح پہلے وہ انکے محاسن کی تبلیغ کرتے تھے اس سے زیادہ انکے معائب کی تبلیغ میں کوشاں ہوئے۔

اس بیان سے یہ ثابت ہو گیا ہو گا کہ اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کا تصادم کوئی نیا تصادم نہیں ہے بلکہ ابتدائے آفرینشِ انسان سے کچھ ہی عرصہ کے بعد سے یہ تصادم شروع ہو گیا تھا اور آج تک جاری ہے۔ اسلیے اسوقت سے لیکر اب تک غیر اسلامی ریاست کے جتنے تخیلات پیش کیے گئے ہیں سب ہماری تنقید کے ذیل میں داخل ہیں۔ خواہ وہ ہندوؤں کے ویدوں والی ریاستیں ہوں یا افلاطون کی مثالی ریاست (Ideal state) یا موجودہ دور کی نازی و جمہوری ریاستیں۔ لیکن دورِ گذشتہ کے تصورات پر تنقید کرنا اسوقت بیسود ہے اسلیے ہم صرف موجودہ دور کے سیاسی افکار کے معائب کو واضح کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

موجودہ دور کے سیاسی نظریات کی تقسیم دو اعتبارات سے کی جا سکتی ہے۔

(۱) فرمانروا یا مقتدرِ اعلیٰ کی تعیین کے اعتبار سے۔

(۲) معاشی اعتبار سے -

اعتبار اول کی بنا پر دو نظریے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ آمریت اور جمہوریت دونوں میں فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آمریت میں فرمانروا ارادۂ انفرادی (Individual will) ہوتا ہے اور جمہوریت میں ارادۂ اجتماعی (General will)۔ لیکن حق یہ ہے کہ دونوں میں جہاں تک اصول کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں ہے۔ عملی صورت میں ضرور کچھ فرق پیدا ہوتا ہے۔ مگر وہ بھی بعض اوقات۔ آمریت میں بھی اجتماعی ارادہ ہی درحقیقت فرمانروا ہوتا ہے جو ایک ڈکٹیٹر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور جمہوریت میں بھی اجتماعی ارادہ اکثریت رکھنے والی پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جمہوریت بھی درحقیقت جماعتی آمریت (Party-dictatorship) کا نام ہے

معاشی اعتبار سے دو قسم کی ریاستیں ہمارے سامنے ہیں، سرمایہ دار ریاست اور اشتراکی ریاست۔ دونوں میں فرق ظاہر ہے۔ اول الذکر میں سرمایہ رکھنے والا طبقہ حکمراں ہوتا ہے اور ثانی الذکر میں مزدور طبقہ فرمانروا ہوتا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ان سب پر علحدہ علحدہ نظر ڈالینگے۔

(باقی)

ضرورت مترجمین

عربی، فارسی، انگریزی سے براہ راست شستہ و رفتہ سلیس اردو میں ترجمہ کرنیوالوں کی ضرورت ہے۔ جو مناسب اجرت پر علمی، ادبی، تاریخی نیز متفرق علوم وفنون کی کتابوں اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کرسکیں۔ کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے۔ علمی قابلیت نیز تجربہ کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے۔ پتہ ذیل پر خط وکتابت کریں۔

شباب۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۶ بمبئی نمبر ۳